جماعت: ہفتم

سلیبس برائے اخلاقیات

کل اسباق کی تعداد: 12

سیکنڈ ٹرم

سبق نمبر	
8	
9.	محنت سے راحت نظم (ہر نظم کے شاعر کا نام یاد کریں)
10	عالمگیر اخوت
11.	اقوام متحدہ
12	ایک ہیں جگ کے سارے لوگ (نظم)
13	انسانی حقوق کا احترام
14	محنت کی عظمت
15	ہمارا پرچم (نظم)
16	حب الوطنی
17	قوت برداشت

نوٹ: ہر سبق میں سے خالی جگہ اور ایک سطری سوال و جواب تیار کریں ورک شیٹ کے لیے

فرسٹ ٹرم میں سے یہ سبق شامل کیے گئے ہیں۔

4.	سماجی بہبود
5.	اتفاق اور محبت کی طاقت
7	دوسروں کا احترام

محنت سے راحت

جو تو نے غفلت میں وقت کھویا نہ کھیت جوتا نہ بیج بویا
تو ایسی ڈوبی ہوئی اسامی سے کوئی حاصل بنائے گا کیا

رہے گا یہ کھیت ہاتھ اس کے جو ہل سے کُشتی لڑے گا دن بھر
جو ہار بیٹھے گا اپنی ہمّت تو وہ زمین کو اٹھائے گا کیا

خوراک و پوشاک کے ذخیرے، دبے پڑے ہیں زمیں کے اندر
جو کر کے محنت نہ کھودے گا تو، تو خاک پہنے گا کھائے گا کیا

سوالات

اس نظم سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے ؟

ہل سے کُشتی لڑنے کا کیا مطلب ہے ؟

آخری شعر میں خوراک اور پوشاک کے ذخیرے سے شاعر کا اشارہ کس طرف ہے ؟

جمعہ 28-8-20

نظم: محنت سے راحت

۱۔ اِس نظم سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

ج۔ اِس نظم سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ محنت کرنی چاہیے۔ وقت برباد نہیں کرنا چاہیے اور محنت میں عظمت ہے۔

۲۔ ہل سے کُشتی لڑنے کا کیا مطلب ہے؟

ج۔ ہل سے کشتی لڑنے کا مطلب محنت سے ہل چلانا ہے۔ جو لوگ محنت کو اختیار کرتے ہیں اور اپنے کام کاج کو پوری ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں وہ اپنے کام میں کبھی ناکام نہیں رہتے۔

۳۔ آخری شعر میں خوراک اور پوشاک کے ذخیرے سے شاعر کا اشارہ کس طرف ہے؟

ج۔ زمین کے اندر بہت ساری معدنیات چھپی ہیں جن کو استعمال میں لاکر انسان بہت فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے زمین میں مدفن ہیں۔ انسان محنت کے ذریعے اِن کو باہر نکال کر اپنی خوراک اور لباس کے لیے ضروری اشیاء کو کام میں لا سکتا ہے۔

عالمگیر اُخوّت

اُخوّت، مساوات یا بھائی چارا اِنسانیت کی جان ہے۔ انسان تمام کائنات میں اشرف ہے لہٰذا اس میں تو یہ جذبہ لازمی طور پر ہونا ہی چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جذبات تو حیوانات میں بھی موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اگر ایک ہی نسل کے حیوان ہل مِل کر نہ رہیں تو وہ کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں۔ وہ ہل مِل کر ہی اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں اور اپنی حفاظت کرتے ہیں۔

پس دیکھنا یہ ہے کہ جب حیوانات، جن میں عقل انسان سے کم ہے، بھائی چارا رکھتے ہیں اور اس کے فائدوں کو محسوس کرتے ہیں تو اِنسان جو اُن پر حکم چلاتا ہے وہ اِس خوبی کو کیسے نظرانداز کر سکتا ہے۔ اِنسان تو اُخوّت کی خوبیوں کو سمجھ سکتا ہے اور اس کے فائدوں کا تجربہ بھی رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بھائی چارے میں کیسی خوبیاں ہیں اور ان کی بدولت وہ کیا اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے اور کیسی پُرسکون زندگی گزارتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں اس کی ضرورتوں کے پورا کرنے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت سے پیش آتے ہیں اور کسی قسم کا ظلم یا زیادتی نہیں ہونے دیتے تو اس طرزِ عمل میں اُسے کیسی خوشی اور کتنا سکون میسّر آتا ہے۔

اِنسانیت دَراصل نام ہے ایک ایسے احساس کا کہ ہم کس طرح اور کیسے ایک دوسرے کی خدمت کریں۔ اُس کی تکلیف دُور کریں اور سکون پہنچائیں۔ اگر ہم حسد، بدگمانی، غیبت اور حرص و طمع جیسی بُرائیوں سے اپنے آپ کو پاک کر لیں تو پھر ہمارے دل میں بھائی چارے کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ ہم اپنے بھائی، اپنے ہم جنس اور ساتھیوں کی خدمت کریں اور یہیں سے جذبۂ اخوت پیدا ہوتا ہے۔ گھر سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی چھوٹا سا جذبہ بڑھ کر محلوں، قصبوں، شہروں کی حدود سے نکل کر ملک میں بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ پھر مُلک میں پوری طرح پروان چڑھ کر جب یہ بین الممالک اور بین الاقوامی سطح پر پہنچتا ہے

تو لامحدود ہو جاتا ہے۔ اس سے جو فائدہ ہوتا ہے اس کے نتائج بھی دُور رَس ہوتے ہیں۔ دو ملک اپنے اختلافات اور غلط فہمیاں آپس میں افہام و تفہیم کے ذریعے دُور کرتے ہیں اور یوں اُخوّت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ جب شک و شبہ، ذاتی مفاد اور خود غرضی کی کیفیت باقی نہیں رہتی تو اندرونِ مُلک ترقّی اور خوش حالی کے اچھے مواقع مل جاتے ہیں جو کہ اختلافات کی صورت میں ممکن نہیں۔ دَراصل اُخوّت وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو بے شمار اچھائیوں کو جنم دیتا ہے اور اِنسانیت کی خدمت کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

سوالات

۱۔۔۔ مساوات یا اخوّت سے اور کون سی اچھائیاں جنم لیتی ہیں؟

۲۔۔۔ انسانیت کسے کہتے ہیں؟

29-8-20 عالمگیر اُخوّت ہفتہ

۱- مساوات یا اُخوت سے اور کون سے اچھائیاں جنم لیتی ہیں؟

ج مساوات اور اُخوت سے درج ذیل اچھائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

۱. مساوات اور اُخوت سے معاشرہ پر اُمن اور ترقی یافتہ ہوتا ہے۔

۲. انسانیت کی خدمت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

۳. آپس میں صلح، افہام وتفہیم کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

۴. معاشرہ خوشحال ہوتا ہے ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔

۵. انسان ایک پُرسکون زندگی گزارتا ہے۔

2- انسانیت کسے کہتے ہیں؟

ج- انسانیت دراصل نام ہے ایک ایسے احساس کا کہ ہم کس طرح اور کیسے ایک دوسرے کی خدمت کریں۔ اُس کی تکلیف دور کریں اور سکون پہنچائیں۔

عنوان:- اقوام متحدہ

صفحہ نمبر 26, 27. 28

نوٹ:- اِس سبق کے تینوں سوال اور جواب کتاب کے صفحوں پر نشان لگا دیئے ہیں۔

اقوامِ متّحدہ

یُوں تو دُنیا میں امن و امان قائم رکھنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں لیکن ایک کامیاب کوشش جو ۱۹۴۲ء میں دُنیا کی بڑی طاقتوں نے مل جل کر کی، وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ یعنی ریاستہائے مُتّحدہ امریکہ، رُوس، برطانیہ اور چین نے مل کر ایک بڑی انجمن "اقوامِ متّحدہ" کے نام سے قائم کی اور اس میں دُنیا کے سب مُلکوں کو شرکت کی دعوت دی تاکہ کہیں جنگ نہ کرنے کا مُعاہدہ کیا جائے۔ لہذا دُنیا کے پچاس ممالک نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں صحیح معنوں میں اقوامِ متّحدہ کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔

"اقوامِ متّحدہ" میں شریک تمام ممالک نے عہد کیا کہ ہم ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کریں گے چاہے وہ مُلک کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اور آپس کے اختلافات کو بات چیت کے ذریعہ ختم کیا جائے گا۔ کوئی مُلک کسی کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دے گا۔

اس عہد نامے کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ آنے والی نسلیں جنگ سے نفرت کریں ایک دوسرے کے حقوق تسلیم کریں اور ان کا احترام کریں اور دُنیا کی تمام قوموں کو بین الاقوامی ذمّہ داریوں کا احساس دلائیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کریں۔

اقوامِ متّحدہ کے کئی ادارے قائم کیے گئے جن میں سے خاص خاص اور اہم ادارے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جنرل اسمبلی: یہ ذمّہ داریوں کو پُورا کرنے کے لیے بنائی گئی۔ عام طور پر اس کا اجلاس ہر سال ہوتا ہے اور اگر دُنیا میں کوئی اہم بات ہو جائے تو سال بھر سے پہلے بھی اس کا اجلاس بُلایا جا سکتا ہے۔ جنرل اسمبلی کے ستائیس رُکن چُنے جاتے ہیں جن کو مختلف اہم کام سونپے جاتے ہیں۔ اس جنرل اسمبلی کے سامنے اقوامِ متّحدہ کے مختلف شعبے ہر سال اپنی رپورٹیں پیش کرتے ہیں۔ پھر ان پر بحث ہوتی ہے اور انہیں مُناسب

ہدایتیں دی جاتی ہیں۔

۲) سلامتی کونسل:۔ اس کونسل کا کام دُنیا میں امن قائم رکھنا ہے۔

۳) معاشی اور معاشرتی کونسل:۔ اس کونسل کا فرض یہ ہے کہ وہ ثقافت اور تعلیم کے میدان میں دُنیا کے ملکوں کا حوصلہ بڑھائے۔ محنت، تعلیم، سائنس اور صحت کے لیے ملکوں کے درمیان رابطہ پیدا کرے۔

۴) بین الاقوامی عدالتِ اِنصاف:۔ اس ادارے کا کام ملکوں کے درمیان غلط فہمیوں سے جو جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں، ان کا فیصلہ کرنا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے پوری دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جن کے نام اور کام یہ ہیں:

۱۔ بین الاقوامی تنظیم محنت:۔ اس تنظیم کا کام یہ ہے کہ مزدوروں کے حالات بہتر بنائے اور ان کی ضرورتوں کے لیے قانون بنا کر اس پر عمل کرنے کا مشورہ دے اور مزدوروں کی محنت کا صلہ اور محنت کرنے کا وقت مقرر کرے۔

۲۔ تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم:۔ (UNESCO) اس ادارے کا کام یہ ہے کہ دُنیا کی قوموں کے درمیان تعلیم، سائنس اور ثقافت کے میدان میں ایسے حالات پیدا کرے جن سے جہالت اور آپس کی نفرت ختم ہو سکے۔ یہ ادارہ کتابیں شائع کرنے کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے اور تحقیقی کام اور طلبا اور اساتذہ کے تبادلوں کے اِنتظامات بھی کرتا ہے۔

۳۔ عالمی ادارۂ صحت:۔ (WHO)۔ اس ادارے کا مقصد اِنسانی صحت کا معیار بلند کرنا ہے اور ضرورت مند ملکوں میں دوائیں اور ڈاکٹروں کو بھیجنا اور دوسرے یہ کہ ڈاکٹروں کو تربیت دینا بھی اس کا فرض ہے۔

۴۔ ادارۂ خوراک و زراعت:۔ اس ادارے کا مقصد دُنیا میں خوراک اور کھیتی باڑی کو ترقّی دینا اور پیسے اور مشینوں سے ان کی مدد کرنا ہے۔

۵۔ بینک برائے تعمیر و ترقّی:۔ اس بینک کا مقصد غریب ممالک کی ترقّی کے لیے

فنی مشورے اور قرضہ دینا ہے۔
۶۔۔۔ عالمی یونین برائے ڈاک۔: اس یونین کا مقصد تمام دُنیا میں ڈاک کے نظام کو بہتر بنانا اور سہولتیں دینا ہے۔
۷۔۔۔ یونین برائے مواصلات۔: اس یونین کا کام ٹیلیفون، ریڈیو، ٹی وی اور مواصلاتی سیّاروں کا اِنتظام کرنا ہے۔
۸۔۔۔ ادارۂ موسمیات۔: اس ادارے کا کام دُنیا کے جُغرافیائی اور موسمی حالات کی خبر رکھنا اور موسموں کی تبدیلی اور خطروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیّار رہنا ہے۔
۹۔۔۔ تجارت کی تنظیم۔ دُنیا کے ملکوں کے درمیان آپس میں آزادی کے ساتھ تجارت کو ترقی دینا اور بے جا پابندیوں کو ختم کرنا ہے۔
۱۰۔۔۔ ایٹمی توانائی کا ادارہ۔: اس ادارے کا مقصد ایٹم کو اِنسان کی بھلائی، صحت، امن اور خوشحالی کے لیے استعمال کرنا ہے۔ 2

سوالات

۱۔۔۔ اقوام متحدہ کب قائم ہوئی اور اس کا مقصد کیا ہے؟
۲۔۔۔ اس کے اہم کام بتائیے؟
۳۔۔۔ کسی خاص تین اداروں کا ذکر کیجیے؟

ایک ہیں جگ کے سارے لوگ

ایک ہیں جگ کے سارے لوگ   سورج، چاند، ستارے، لوگ

امریکی، روسی، جاپانی
مصری، چینی، انگلستانی
شامی، افریقی، ایرانی
عربی، ترکی، پاکستانی

ایک ہیں جگ کے سارے لوگ   سورج، چاند، ستارے، لوگ

انسانیت کے شیدائی
سب آپس میں بھائی بھائی
پھر کیسی یہ جنگ لڑائی
دور ہوئی اب ہر کٹھنائی

ایک ہیں جگ کے سارے لوگ   سورج، چاند، ستارے، لوگ

دل سچائی کا آئینہ
پاک کدورت سے ہر سینہ
کیسی عداوت کیسا کینہ
مہر و وفا کا ہم ہیں خزینہ

ایک ہیں جگ کے سارے لوگ   سورج، چاند، ستارے، لوگ

نیکی کی خوشبو کے پیکر
خوبی میں ہم سب سے بڑھ کر
ہم سے روشن ہر بام و در
یہ ہے نعرہ اپنے لب پر

ایک ہیں جگ کے سارے لوگ   سورج، چاند، ستارے، لوگ

سوالات

۱۔۔۔ شاعر نے سارے جگ کے لوگوں کو کس کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

۲۔۔۔ پاکستانی، عربی، ایرانی، مصری یا جاپانی کس وجہ سے ایک ہیں؟

۳۔۔۔ ہمارے لب پر کیا نعرہ ہونا چاہیے؟

نظم :- ایک ہیں جگ کے سارے لوگ

۱۔ شاعر نے سارے جگ کے لوگوں کو کس کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

ج۔ شاعر نے سارے جگ کے لوگوں کو چاند، ستاروں اور سورج سے تشبیہ دی ہے۔

۲۔ پاکستانی، عربی، ایرانی، مصری یا جاپانی کس وجہ سے ایک ہیں؟

ج۔ پاکستانی، عربی، ایرانی، مصری یا جاپانی انسانیت کے رشتے کے ناطے سے ایک ہیں۔

۳۔ ہمارے لب پر کیا نعرہ ہونا چاہیے؟

ج۔ ہم سب کو انسان ہونے کے ناطے سب قومیتوں، رنگ و نسل کے لوگوں کا احترام کرنا ہے ہمارے لب پر نیکی کو پھیلانے اور دوسروں کے ساتھ ایثار، محبت اور خلوص کو پھیلانے کا نعرہ ہونا چاہیے۔

انسانی حقوق کا احترام

پارسا بی بی کے چار بچّے تھے۔ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں۔ بڑی بیٹی چوتھی جماعت میں، دُوسری تیسری جماعت میں اور چھوٹی بیٹی اور بیٹا دوسری جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ اس کا شوہر ہاشم جو سدا کا روگی تھا، بستر پر پڑا کھانستا رہتا تھا۔ اس لیے گھر کا خرچ چلانے کے لیے اسے نوکری کرنی پڑتی تھی۔

صبح اُٹھتے ہی پارسا بی بی رات کے بچے ہوئے روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر بچّوں اور ہاشم کو کھلاتی اور خود نہار مُنہ ٹوکری لے کر گھر سے نکل پڑتی۔ اسے محلّوں اور گلیوں کے نام یاد نہیں تھے۔ ایک مرتبہ ایک پڑوسی نے رحم کھا کر ایک بس میں سوار کرا دیا تھا۔ وہ اس بس کو پہچانتی تھی۔ بس اسے ان بنگلوں کے پاس اُتار دیتی تھی جہاں وہ کام کرتی تھی۔ اس طرح تین سو روپے کما لیتی تھی۔ رات کا بچا ہوا سالن اور روٹی وہ گھر لے جاتی۔ پھٹے پُرانے کپڑوں سے بچّوں کا تن ڈھانکتی اور بیمار شوہر کی دیکھ بھال کرتی۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اس کے بچّے تعلیم حاصل کریں۔ جن گھروں میں وہ کام کرنے جاتی ان کے بچّوں سے پُرانی کتابیں لا کر اپنے بچّوں کو دے دیتی۔

دُبلی پتلی پارسا بی بی چُپ چاپ خاموشی سے اس اُمید پر کام کیے جاتی کہ شاید اسے زیادہ کام کرنے سے اسے زیادہ پیسے مل جائیں گے۔ لیکن اسے کبھی زیادہ پیسے نہ ملتے۔ وہ نہایت ایماندار عورت تھی۔ اکثر عورتیں پڑوس میں گھر کی چابی رکھ جاتیں کہ پارسا بی بی آئے تو اسے کام کرنے کے لیے دے دیں۔ وہ کام کاج سے فارغ ہو کر گھر کا تالا لگاتی اور چابی واپس پڑوسن کو دے دیتی۔ کسی کو اِتنی فرصت نہیں تھی کہ اس سے اس کی زندگی کی ضرورتوں کے بارے میں پوچھتا۔

ایک دن طاہرہ کے گھر میں کام کرتے کرتے پارسا بی بی گر پڑی۔ طاہرہ نے لپک کر اُسے اُٹھایا اور اس کی طبیعت پوچھی۔ لیکن اس میں جواب دینے کی بھی طاقت نہ تھی

بہت پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بھوکی ہے۔ طاہرہ نے اسے زبردستی کھانا کھلایا۔ جب وہ بات کرنے کے لائق ہوئی اور طاہرہ نے بہت اصرار کیا تو اس نے کہا۔" باجی میں چاہتی ہوں کہ میرے بچے پڑھیں، میری بیٹیاں ہاتھ کا کام کریں، پھول بنائیں، کشیدہ کاری کریں، میرا بیٹا پڑھ لکھ کر ہوائی جہاز اُڑائے اور میرا شوہر تندرست ہو جائے"۔ طاہرہ نے کہا پارسا بی بی یہ تو تمہارا حق ہے جو تمہیں ملنا چاہیے۔

بہت سوچ بچار کے بعد طاہرہ علاقے کے ایک نیک آدمی کے پاس گئی اور پارسا بی بی کے حالات اسے سُنا کر مدد کی درخواست کی۔ اس نے بچوں کے لیے ایک معقول رقم بطور وظیفے کے دینے کا وعدہ کیا اور بڑی بیٹی کو سلائی کے لیے مشین دے دی۔ طاہرہ نے گھر آ کر اسپتال میں ڈاکٹر کو فون کیا اور ہاشم کی کیفیت بتائی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہاشم کو بُلا کر اس کا مکمل معائنہ کیا اور اسپتال میں داخل کر کے دواؤں کا انتظام بھی کر دیا۔

اب طاہرہ نے پارسا بی بی کو اچھی طرح سمجھا کر بچوں کے اسکول بھیجا اور بتایا کہ وہاں جا کر ہیڈ ماسٹر اور ہیڈ مسٹریس سے کیا کہے گی۔ پارسا بی بی نے اسکول جا کر اپنا مسئلہ اس طرح پیش کیا کہ تینوں بچوں کی فیس معاف کر دی گئی۔

پارسا بی بی نے طاہرہ سے قرض لے کر بچوں کے لیے کاپیاں اور کتابیں خریدیں اور گھر پر آ کر پُرانے کپڑوں سے کتابوں کے لیے بستے اپنے ہاتھ سے سیے اور بچوں کو اسکول بھیجا۔

پارسا بی بی حسبِ معمول کام کرتی رہی لیکن اب اس کی صحت گرنے لگی تھی۔ طاہرہ نے اُسے بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا اور وہ اچھا خاصا پڑھنے لگی تھی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ایک ہفتے تک وہ کام کرنے نہیں آئی۔ ورنہ وہ تو گھڑی کی سوئیوں کی طرح وقت پر آ کر کام کیا کرتی تھی۔ آٹھویں دن وہ کام پر آئی تو پتا چلا کہ اسے ملیریا بخار ہو گیا تھا۔ اس کی بیٹی اسے سرکاری اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر نے دوائیں دے کر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ دونوں بہنوں نے اس کی بڑی خدمت کی اور اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا۔

مہینہ ختم ہونے کے بعد حساب لگایا کہ تو معلوم ہوا کہ لوگوں نے غیر حاضری کے پیسے کاٹ لیے ہیں. لیکن پارسا اب سمجھ دار بن گئی تھی وہ کپڑے کے ایک ٹھیکیدار کے یہاں گئی اور چادر اور تولیوں کے کنارے سینے کے لیے اتنا سامان لے آئی کہ ایک دن کی سلائی میں دو دن کا خرچ آسانی سے نکل سکتا تھا۔

بڑی لڑکی صبح اسکول جاتی، دوپہر کو گھر کا کام کاج کرتی اور پھر مشین لے کر سلائی کرنے بیٹھ جاتی۔ پارسا کھانے پینے کی چیزیں لے کر اسپتال روانہ ہو جاتی اور شام کو واپس آتی تو بچّے لالٹین کی روشنی میں پڑھتے ہوئے ملتے۔ تین مہینے میں ہاشم بھی تندرست ہو کر گھر آگیا۔ وہ بجلی کا کام جانتا تھا۔ لہٰذا ایک دوکان پر ملازم ہو گیا۔

پارسا بی بی اور ہاشم نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی ایک گھڑی ساز سے طے کر دی جس کی اپنی دوکان تھی اور بہت ایمان دار اور محنتی تھا۔ محلّے والوں اور ماں باپ کی دُعاؤں کے ساتھ وہ رُخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ گھر میں اس کی جگہ اب منجھلی لڑکی نے لے لی۔

پارسا بی بی کا لڑکا بھی لکھ پڑھ کر کمانے لگا اور اب یہ گھرانہ خوشحال ہے۔

سوالات

۱۔ پارسا بی بی کون تھی اور اپنے بچّوں کی کس طرح پرورش کرتی تھی؟

۲۔ طاہرہ کون تھی اور اس نے پارسا بی بی کی کس طرح مدد کی؟

۳۔ پارسا بی بی کی زندگی سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

انسانی حقوق کا احترام

۱. پارسا بی بی کون تھی اور اپنے بچوں کی کس طرح پرورش کرتی تھی؟

ج. پارسا بی بی ایک غریب مگر خوددار عورت تھی وہ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے پیسے کماتی اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔

۲. طاہرہ کون تھی اور اس نے پارسا بی بی کی کس طرح مدد کی؟

ج. طاہرہ اس گھر کی مالکن تھی جہاں پارسا محنت مزدوری کرتی تھی۔ ایک دن پارسا کی طبیعت خراب ہوئی تو طاہرہ پر پارسا کے حالات کا انکشاف ہوا۔ طاہرہ نے علاقے کے ایک نیک آدمی سے پارسا کی مدد کو کہا ڈاکٹر سے کہہ کر اس کے شوہر کے علاج کا انتظام کیا۔ اور ایک سکول میں اس کے بچوں کے داخلے کے لیے کوشش کی

۳. پارسا بی بی کی زندگی سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

ج. پارسا بی بی کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ محنت کرنی چاہیے اور ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔

محنت کی عظمت

منظر (گاؤں کے ایک ادھورے مکان کا پچھلا حصّہ۔ ایک طرف موسم کی سبزیاں لگی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف بجری کا ڈھیر ہے اور سیمنٹ کی کھلی ہوئی بوری رکھی ہے۔ سامنے ہی اینٹیں بنانے کا مسالہ تیار ہے۔ یہاں ایک صاحب شلوار قمیص کا عام لباس پہنے ہوئے اینٹیں بنا رہے ہیں۔)

تین لڑکے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان صاحب کے پاس پہنچتے ہیں اور با آوازِ بلند کہتے ہیں:

"ماسٹر صاحب السلام علیکم" ماسٹر صاحب سر اُٹھا کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں:

"وعلیکم السلام! کہو بھئی لڑکو! کیسے ہو۔ آج کیسے راستہ بھول گئے؟"

ایک لڑکا ــــ "سر میرے دو دوست شہر سے آئے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج آپ کی خدمت میں حاضری دی جائے لہٰذا حاضر ہو گئے۔"

ماسٹر صاحب ــ آؤ بھئی آؤ۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم لوگ چھٹیوں میں کیا کر رہے ہو گے۔ چلو اندر چلیں۔

(سب کمرے میں آئے۔ یہاں بید کا صوفہ سیٹ، لکھنے کی میز، کرسیاں، کتابوں کی الماری اور کارنس پر گلدان رکھا تھا جس میں تازہ تازہ پھول سجے ہوئے تھے سب صوفے پر بیٹھ گئے)

ماسٹر صاحب ــ بھئی کیا پیو گے۔ چائے یا لیموں کا شربت؟

(لڑکے خاموش رہتے ہیں اور ماسٹر صاحب شربت بنانے کے لیے چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں لڑکے باتیں کرنے لگتے ہیں)

ایک لڑکا ــ "کمال ہے ماسٹر صاحب خود اینٹیں بنا رہے ہیں!"

اسلم نے کہا ــ تمہیں نہیں معلوم؟ یہ کمرہ ماسٹر صاحب نے ان گرمیوں کی چھٹیوں میں خود بنایا ہے۔ تم تو شہر گئے ہوئے تھے مگر ہم نے تو خود ان کے ساتھ مل کر اس کی چھت ڈلوائی تھی۔" (ماسٹر صاحب کشتی میں چار گلاس اور شربت کا جگ لے کر آئے اور میز پر

رکھ کر شربت اُنڈیلنے لگے۔ ایک لڑکے نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے جگ لے لیا اور شربت گلاسوں میں اُنڈیلنے لگا۔

اسلم — "سر! یہ آپ کے درخت ہی کے لیموؤں کا شربت ہے نا؟"

ماسٹر صاحب — "ہاں بیٹے! اِس سال اِس چھوٹے سے درخت نے بہت پھل دیے میں نے کچھ لیموؤں کا اچار بھی ڈالا ہے۔"

اسلم — "بابا تو آپ کا بھیجا ہوا شربت بہت احتیاط سے تھوڑا تھوڑا کر کے پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تبرّک ہے۔"

ماسٹر صاحب — "یہ ان کی محبت ہے بیٹا۔"

اسلم — "سر، آپ سب کام خود ہی کیوں کرتے ہیں؟ چوکیدار بھی تو موجود ہے۔ اس سے کام کیوں نہیں لیتے؟"

ماسٹر صاحب — بیٹے اپنا کام خود کر کے جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس کو بیان کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ یوں سمجھو کہ سخت محنت کے بعد جب اس کا ثمر ملتا ہے تو ایسا سکون ملتا ہے کہ جنت کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

ایک لڑکا — سر ہمیں بھی آج محنت کی عظمت کے بارے میں کچھ بتائیے۔ اگر آپ کو فرصت ہو؟

ماسٹر صاحب — اچھا یوں ہی سہی۔

دیکھو بیٹے! انسان اِس دُنیا میں آیا ہے تو اس کے سامنے زندگی گزارنے کے لیے کوئی بڑا مقصد ہونا چاہیے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جب تک وہ سخت محنت نہ کرے وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ یوں زندگی گزارنے کے لیے تو جانور بھی زندہ ہیں لیکن انسان اشرف المخلوقات اسی لیے کہلاتا ہے کہ دُنیا میں وہ اس انداز سے زندگی گزارے کہ اس کے کیے کام سے دوسرے فائدہ اُٹھائیں۔

خدا نے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، ناک، کان سب اِسی لیے دیے ہیں کہ ہم ان سے کام لیں۔ دوسروں کا محتاج ہونا بڑی معیوب بات ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم اپنا ہر کام خود محنت اور ایمانداری سے کریں تو کام وقت پر پُورا ہوگا اور اسی طرح اگر سب

لوگ اپنا اپنا کام محنت سے سر انجام دینے لگیں تو مُلک کے بہت سے شعبوں کو ترقّی ہوگی۔
سب سے پہلے تو تم زراعت کے شعبے کو دیکھو۔ کسان دن رات محنت کرتا ہے۔ مُردہ زمین میں ہل چلاکر بیج بوتا ہے، پانی دیتا ہے فصل کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا ہے تو فصل اچھی ہوتی ہے، اناج زیادہ پیدا ہوتا ہے اور مہنگائی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اب کارخانوں کو دیکھو۔ اگر مزدور محنت اور ایمانداری سے کارخانوں میں کام نہ کرے تو ملیں کپڑا نہیں بنا سکتیں۔ محنت کے بَل بُوتے پر ہی پاکستان کا کپڑا پوری دُنیا میں مشہور ہے۔

تعلیم کے شعبے کو دیکھو۔ ہمارے طالب علم کتنے ضروری علم سیکھ کر ڈاکٹر، انجینئر اور سائنسدان بن رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ڈاکٹروں اور انجینئروں کا مقابلہ دُنیا کے ماہرین سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی محنت سے پڑھتے ہیں اور پھر عوام کی خدمت بڑی لگن اور خلوص سے کرتے ہیں جس سے ان کی عزّت کی جاتی ہے۔

اور بھی تمام پیشوں کو دیکھ لو۔ پاکستان میں لوگ زندگی کے ہر میدان میں محنت اور کوشش کر کے ترقی کر رہے ہیں۔ یہ محنت ہی تو ہے جس کی وجہ سے ہمارا مُلک دُوسرے مُلکوں کا محتاج نہیں بلکہ اپنی ضروریات کا سامان خود ہمارے یہاں بنتا ہے۔

لہٰذا ثابت ہوگیا کہ محنت میں مُلک و قوم کی عظمت پوشیدہ ہے۔ جو لوگ محنت نہیں کرتے ان لوگوں میں طرح طرح کی بُری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جس قوم میں سُست اور کاہل لوگ ہوتے ہیں وہ قوم ترقّی نہیں کر سکتی اور ان میں رشوت، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، جھوٹ اور فریب جیسی اخلاقی بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے مُلک بدنام ہوتا ہے۔ دوسرے مُلک کے لوگ ایسی قوموں کی عزت نہیں کرتے۔

اِس کے علاوہ اگر جسمانی محنت نہ کی جائے تو اِنسان سُست ہو کر بیمار ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کی بیماریاں پیچھے لگ جاتی ہیں۔

آپ لوگ دُنیا کے عالموں اور دانشوروں کے حالات پڑھیے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان لوگوں کے ذہنوں کو محنت ہی نے جِلا بخشی۔ اگر سائنس دان خود

تجربہ نہ کرتے تو سوچیے کہ نئی نئی ایجادات کس طرح ہوتیں۔ اسی طرح ہنرمندوں اور محنت کشوں پر بھی غور کیجیے۔ اگر یہ بزرگ خود اپنا کام محنت سے کرنے کی عادت نہ ڈالتے تو دنیا اتنی ترقّی کیسے کرسکتی تھی۔ اگر ہر شخص محنت کرنے لگے تو قوم کے افراد محنت اور بچت کے عادی ہو جائیں گے اور پھر ہمارا مُلک اس ترقّی یافتہ دُنیا میں اہمیّت حاصل کرسکتا ہے۔

لڑکے۔ ماسٹر صاحب! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اَب محنت سے کبھی جی نہ چُرائیں گے۔ خدا حافظ۔

سوالات

۱۔ محنت کسے کہتے ہیں؟

۲۔ محنت کرنے سے مُلک کس طرح ترقّی کرسکتا ہے؟ (long)

محنت کی عظمت

۱. محنت کسے کہتے ہیں؟

ج. محنت سے مراد یہ ہے کہ اپنے کام کو خود اپنے ہاتھ سے کیا جائے یا خود کام کر کے اپنے لیے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے روزی کمائی جائے۔ محنت کرنے والے کو محنتی کہا جاتا ہے۔

۲. محنت کرنے سے ملک کس طرح ترقی کر سکتا ہے؟

ج. محنت میں ملک و قوم کی عظمت پوشیدہ ہے۔ جو لوگ محنت نہیں کرتے ان لوگوں میں طرح طرح کی بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جس قوم میں سست اور کاہل لوگ ہوتے ہیں وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ اور ان میں رشوت، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، جھوٹ اور فریب جیسی اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے ملک بدنام ہوتا ہے۔ دوسرے ملک کے لوگ ایسی قوموں کی عزت نہیں کرتے۔ اِسکے علاوہ اگر جسمانی محنت نہ کی جائے تو انسان سست ہو کر بیمار ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کی بیماریاں اُس کے پیچھے لگ جاتی ہیں۔

اِسکے علاوہ دنیا کے عالموں اور دانشوروں کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہنوں کو محنت نے ہی جلا بخشی

اگر سائنس دان خود تجربہ نہ کرتے تو نئی نئی ایجادات کس طرح ہوتیں؟ اسی طرح ہنر مند اور محنت کش اگر خود اپنا کام محنت سے کرنے کی عادت نہ ڈالتے تو دنیا اتنی ترقی کیسے کر سکتی تھی. اگر ہر شخص محنت کرنے لگے تو قوم کے افراد محنت اور بچت کے عادی ہو جائیں گے اور ملک ترقی کرے گا.

ہمارا پرچم

اُجلا اُجلا پیارا پیارا اُمیدوں کا تارا ہے
اُونچا اُونچا پھیلا پھیلا کاہ کشاں کا دھارا ہے
روشن روشن جھلمل جھلمل جگمگ جگمگ سارا ہے
میرے وطن کا سبز ہے پرچم جس پر چاند ستارا ہے

صبح کو سُورج کی کرنوں میں ہنستا ہے مُسکاتا ہے
شام کو چاند کی کومل کومل لہروں پر لہراتا ہے
دوشِ رُخِ ہَوا پر جیسے کوئی نور کا دھارا ہے
میرے وطن کا سبز ہے پرچم جس پر چاند ستارا ہے

صُلح پسندوں کے دامن کو خوشیوں سے بھر دیتا ہے
دُشمن کی میلی نظروں کو خاکستر کر دیتا ہے
میرے وطن کا بچہ بچہ پھُول ہے اور انگارا ہے
میرے وطن کا سبز ہے پرچم جس پر چاند ستارا ہے

سبز ہلالی پرچم سے ہے شانِ وطن اور آنِ وطن
یہ پرچم ایمانِ وطن، ایقانِ وطن، عرفانِ وطن
اس پرچم کو اُونچا رکھنا قومی فرض ہمارا ہے
میرے وطن کا سبز ہے پرچم جس پر چاند ستارا ہے

اصغر سودائی

سوالات

۱۔ شاعر نے بچوں کو پھُول اور انگارا کیوں کہا ہے؟
۲۔ ہمارا قومی فرض کیا ہے؟

نظم :- ہمارا پرچم

۱- شاعر نے بچوں کو پھول اور انگارہ کیوں کہا ہے؟

ج شاعر نے اپنے وطن کے بچوں کو پھول اس لیے کہا ہے کیونکہ وہ پھولوں جیسے خوبصورت ہیں اور شاعر نے بچوں کو انگارہ اس لیے کہا ہے کیونکہ وہ بہادر ہیں اور اپنے وطن کے دشمنوں کے لیے آگ کے انگارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے آگ ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے اسی طرح وطن کے بچے دشمن کو نیست و نابود کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

۲. ہمارا قومی فرض کیا ہے؟

ج ہمارا قومی فرض ہے کہ اس پرچم کو اونچا رکھا جائے۔ اگر ہم اپنے پرچم کو اونچا نہیں رکھیں گے تو یہ تنزلی کا باعث ہوگا۔

۳. شاعر کا نام :- اصغر سودائی

حُبُّ الوَطنی

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا دَور ایسا دور تھا جب اخلاق کی قدر نہ کی جاتی تھی۔ فکر و عمل اور اخلاق و کردار کی صورت بگڑتی جا رہی تھی۔ طبقوں کے فرق نے غریبوں کے لیے زندگی کو عذاب بنا دیا تھا۔ امیروں کے لیے ہر طرح کے آرام و آسائشیں موجود تھیں اور غریب بیچارے زمین کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ طرح طرح کی تکلیفوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ شاہ صاحب جیسا انسان دوست اور ہمدرد و رحم دل انسان بھلا ان چیزوں کو کیسے دیکھ سکتا تھا اور خاموش تماشائی بنا رہتا۔ آپ نے دُکھی انسانیت کو محبّت کا پیغام دیا۔ دراصل آپ نے اپنی زندگی کا یہ مقصد قرار دیا تھا کہ بگڑی ہوئی زندگی کو اُچھے اخلاق اور پاکیزہ کردار سے آراستہ کیا جائے، ظلم کے درخت کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ اور انسانوں میں ایک دوسرے سے محبّت اور خلوص کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ لوگوں میں بغض و حسد، حرص، ظلم اور تشدّد سے نفرت پیدا ہو جائے۔

قدرت نے شاہ صاحب کو درد مند اور نرم دل عطا کیا تھا۔ شروع ہی سے بیابان در بیابان گھومنا۔ وطن کے قدرتی مناظر پر غور کرنا۔ مختلف تاریخی اور غیر تاریخی مقامات کے آثار دیکھ کر اہلِ وطن سے خود محبّت کرنا اور عوام کو ان سے روشناس کرانا۔ طرح طرح کے سادھو، جوگی، فقیر، درویش، قلندر، موسیقاروں سے ملنا جلنا، ان کی عادتوں کو بغور دیکھنا، اپنے ہم وطنوں اور دُور دراز کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کی عادتوں کا مقابلہ کرنا اور پھر سنجیدگی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچنا کہ صرف مُحبّت ہی وہ شے ہے جس کی وطن اور اہلِ وطن کی ضرورت ہے۔

وہ دولت مندوں سے دُور اور غریب عوام سے قریب تھے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے اہل وطن کو کم سونے، کم کھانے، کم بولنے، خود غرضی سے بچنے، دوسروں کی بھلائی کرنے، سادہ پوشاک پہننے، راضی برضا رہنے کی تلقین کی۔ ان کا کلام عالم رنگ

راگنیوں میں گایا جاتا ہے۔ تاکہ یہ آواز سب تک پہنچ کر دل پر اثر کرسکے۔ رحم دلی کا یہ عالم تھا کہ انسان تو انسان، پرندوں کو بھی ستانا یا ایذا پہنچانا بہت بُرا سمجھتے تھے۔ وطن اور اس کائنات کے ذرّے ذرّے سے انہیں ایسی محبت تھی کہ اُن کو دیکھ کر اُن کی شاعری میں ایک خاص حُسن اور موسیقی پیدا ہوجاتی تھی۔

انہوں نے اپنے پیغام کو عام بنانے کے لیے اپنی شاعری میں سندھ کی رُومانی داستانوں کو بنیاد بنایا۔ یہ داستانیں سندھ کے لوگ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ انہوں نے اپنا پیغام علاقائی زبان ہی میں دیا جو عام لوگ خوب سمجھتے تھے اور اس کا اثر قبول کرتے تھے۔

شاہ صاحب کو اپنے وطن سندھ سے بڑی محبت تھی۔ وہ اپنے وطن والوں کے دل میں وطن کی محبت کے چراغ روشن کرنا چاہتے تھے اور اس میں کامیاب رہتے تھے۔ وہ اپنے اہلِ وطن کی بے عملی اور ٹھہری ہوئی زندگی کو دیکھ کر بہت کُڑھتے اور بے چین ہوجاتے تھے۔ اس بے حِسی کو ختم کرنے کے لیے وہ سندھی معاشرے کی ایک ایک رسم کو مثال بنا کر عمل کی بڑے سُتھرے اور میٹھے لہجے اور انداز میں دعوت دیتے تھے۔ ان میں صبر و قناعت کی درویشانہ صفت اپنے درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ انسان کی بَھلائی اور محبت ان کی شاعری کا موضوع اور زندگی کا مقصد تھا۔ ان کے یہاں نفرت، عداوت اور اخلاقی خرابیوں کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

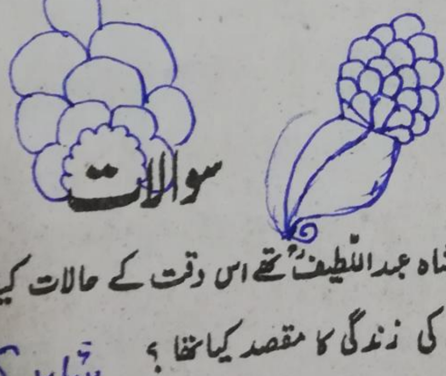

سوالات

۱۔ جس دَور میں شاہ عبداللطیفؒ تھے اس وقت کے حالات کیا تھے؟

۲۔ شاہ صاحب کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟

۳۔ شاہ صاحب نے اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کے لیے کیا ذریعہ اختیار کیا؟

حبّ الوطنی

۱ جس دور میں شاہ عبداللطیف تھے اس وقت کے حالات کیا تھے؟

ج شاہ عبداللطیف بھٹائی کا دور ایسا دور تھا جب اخلاق کی قدر نہ کی جاتی تھی۔ فکر و عمل اور اخلاق و کردار کی صورت بگڑتی جا رہی تھی۔ طبقوں کے فرق نے غریبوں کے لیے زندگی کو عذاب بنا دیا تھا۔ امیروں کے لیے ہر طرح کے آرام و آسائشیں موجود تھیں اور غریب بے چارے زمین کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ طرح طرح کی تکلیفوں کا شکار ہونے رہتے تھے۔

۲ شاہ صاحب کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟

ج آپ نے اپنی زندگی کا یہ مقصد قرار دیا تھا کہ بگڑی ہوئی زندگی کو اچھے اخلاق اور پاکیزہ کردار سے آراستہ کیا جائے، ظلم کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ اور انسانوں میں ایک دوسرے سے محبت اور خلوص کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ لوگوں میں بغض و حسد، حرص، ظلم اور تشدد سے نفرت پیدا ہو جائے۔

۳. شاہ صاحب نے اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کے لیے کیا ذریعہ اختیار کیا؟

ج شاہ صاحب نے اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کے لیے شاعری کا ذریعہ اختیار کیا۔ شاہ صاحب کا کلام عام راگ راگنیوں میں گایا جاتا ہے۔ تاکہ یہ آواز سب تک پہنچ کر دل پر اثر کر سکے۔

سبق: قوت برداشت

۱. زاہد صاحب کون تھے اور کیا کرتے تھے؟

ج زاہد حسین ایک شریف اور بھلے انسان تھے۔ وہ لڑائی جھگڑے سے دور رہتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی منع کرتے تھے۔ زاہد صاحب ایک کارخانے میں فورمین تھے۔

۲. زاہد صاحب نے لوگوں کے جھگڑے کو کیسے ختم کرایا؟

ج زاہد صاحب نے لوگوں سے کہا ذرا صبر سے کام لیں اور ٹھنڈے دل سے اطمینان سے بات کریں۔ ان کا لہجہ اتنا نرم تھا کہ لوگ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ آخر زاہد صاحب نے بیچ بچاؤ

کروا دیا کہ قرض دار کو پانچ تاریخ تک رقم واپس کر دی جائے گی۔
قرض خواہ مطمئن ہو گیا اور بات ختم ہو گئی۔

۳ زاہد صاحب کا کردار بیان کریں۔

ج غرض آئے دن یوں ہی کوئی نہ کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا لوگ تماشا دیکھنے کو جمع ہو جاتے مگر جھگڑے کو ختم کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا۔ لیکن زاہد صاحب کی نرم مزاجی اور قوت برداشت سے سب لوگ متاثر ہو جاتے اور لڑائی جھگڑا ختم ہو جاتا۔

۴ قوت برداشت سے اسکوائر کے رہنے والوں کو کیا فائدہ ہوا؟

ج زاہد صاحب کی قوت برداشت نے اسکوائر کے رہنے والوں میں بھی قوت برداشت پیدا کر دی۔ اب جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو یونین والے زاہد صاحب کو ضرور بلاتے ہیں تاکہ مسائل حل کرنے میں وہ لوگوں کی مدد کر سکیں۔

قوتِ برداشت

زاہد حسین ایک کارخانے میں فورمین تھے۔ ان کے کارخانے کے قریب ایک اسکوائر تھا۔ اسی اسکوائر میں انہوں نے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا۔ ان کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اقبال اور ایک لڑکی سو بیہ تھی۔ لڑکا ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا اور لڑکی پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ چھوٹا خاندان تھا اس لیے یہ چھوٹا سا گھر ان کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ ان کی بیگم بہت سلیقہ شعار اور ملنسار تھیں۔ گھر کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھیں۔ بچے بھی ہنس مکھ اور تمیزدار تھے۔ اسکوائر کا یہ حصہ کافی ستھرا تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ یہاں آباد تھے۔

چھٹی کا دن تھا۔ سامان سلیقے سے رکھنے میں بچے اور دونوں میاں بیوی تھک کر چور ہو گئے۔ شام کو پڑوسی ملنے کے لیے آئے جن میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ زاہد صاحب سب سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور پڑوسیوں نے بھی ان کو نئے گھر کی مبارکباد دی۔

دوسرے دن صبح ہی زاہد صاحب اور بچے ناشتا کر کے گھر سے نکلے۔ انہوں نے اپنی اسکوٹر پر دونوں بچوں کو آگے پیچھے بٹھایا اور انہیں اسکول چھوڑتے ہوئے کارخانے چلے گئے اور بیگم زاہد گھر کو تالا لگا کر سودا لینے گھر سے نکلیں۔ بازار قریب ہی تھا جب وہ قصائی کی دوکان پر گوشت لینے پہنچیں تو دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہر عورت کی یہ خواہش تھی کہ پہلے اس کو گوشت مل جائے یہی حال پرچون کی دوکان پر تھا۔ مرد، بچے اور عورتیں سودا پہلے لینے پر جھگڑ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑے صبر سے انتظار کیا کہ ان کی باری آئے۔ کافی دیر بعد دوکان دار نے کہا بی بی آپ آگے آ جائیے بہت دیر سے کھڑی ہیں۔ انہوں نے جنس کی فہرست دوکاندار کو دی۔ اس نے پتہ پوچھا تو اس نے کہا آپ گھر جائیے میں نوکر کے ہاتھ سامان بھیجتا ہوں آپ اسی کو پیسے دے دیجیے گا۔ غرض ایک گھنٹے کے اندر سامان آگیا اور وہ کھانا پکانے میں لگ گئیں۔ دوپہر کو گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اسکول گئیں اور بچوں کو لے کر آگئیں۔

کھانا کھلا کر جب وہ بچوں کے ساتھ آرام کی غرض سے لیٹیں تو اسکوائر کے بچوں نے سڑک

پر گیند بلا کھیلنا شروع کیا۔ گیند کھڑکی پر لگی اور چھن سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ انہوں نے بچّوں کو اُٹھنے نہیں دیا اور خود کھڑکی سے باہر دیکھا۔ انہیں دیکھ کر کچھ بچّے بھاگے اور کچھ کھڑے رہے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے کہ اس لڑکے نے گیند ماری تھی۔ وہ خاموش رہیں کچھ نہ بولیں اور آکر لیٹ گئیں اور دل ہی دل میں ایک منصوبہ بنایا۔ شام کو چائے پر مٹھائی اور سموسے منگا کر گلی کے سب بچّوں کو برآمدے میں جمع کیا۔ ان سے اپنے بچّوں کا تعارف کرایا کہ اب یہ بھی تمہارے ساتھ کھیلا کریں گے۔ سندھی، پنجابی، بلوچی، مکرانی، پٹھان ہر جگہ کے بچّے تھے لیکن انہیں اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بلا کر ڈانٹیں گی، شرمندہ ہو گئے آنٹی اب ہم احتیاط سے کھیلا کریں گے، کبھی ایسی شرارت نہیں کریں گے اور واقعی ان بچّوں نے اپنے وعدے کو پُورا کیا بلکہ اگر کبھی بیگم زاہد کو بازار سے آتا دیکھتے تو ان کے ہاتھ سے سامان لے لیتے اور گھر تک پہنچا دیا کرتے۔

ایک شام زاہد صاحب گھر آئے۔ رات کا کھانا کھا کر ٹی وی سے خبریں سُن رہے تھے کہ بہت سے آدمیوں کے لڑنے اور گالی گلوچ کی آوازیں سُنائی دیں۔ وہ گھبرا کر باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ ایک قرض خواہ اپنا قرض مانگنے آیا تھا وہ گالیاں دے رہا تھا۔ لوگ جمع تھے۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں اور آپس میں گتھم گتھا ہونے کو تیار تھے کہ زاہد صاحب بیچ میں آگئے۔ آپ لوگ ذرا صبر سے کام لیں اور ٹھنڈے دل سے اطمینان سے بات کریں۔ ان کا لہجہ اتنا نرم تھا کہ لوگ تھوڑی دیر کے لیے چُپ ہو گئے۔ آخر زاہد صاحب نے بیچ بچاؤ کروادیا کہ قرض دار کو پانچ تاریخ تک رقم واپس کر دی جائے گی۔ قرض خواہ مطمئن ہو گیا۔ غرض آئے دن یوں ہی کوئی نہ کوئی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا لوگ تماشا دیکھنے تو جمع ہو جاتے مگر جھگڑے کو ختم کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا۔ لیکن زاہد صاحب کی نرم مزاجی اور قوّت برداشت سے سب لوگ متاثر ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو زاہد صاحب کو بھی باتیں سُننا پڑتیں کہ آپ کون ہیں ہمارے بیچ میں بولنے والے۔ لیکن زاہد صاحب بڑے اطمینان سے کہہ دیتے آپ کا ہمسایہ بھائی ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو آپ آکر مجھ سے ضرور شکوہ کریں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ میں سے کسی کو بھی میری ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ اسکوائر ہم سب لوگوں کا

گھر ہے جس طرح حقیقی بہن بھائیوں کے مزاج ایک طرح کے نہیں ہوتے لیکن سب ایک ہی گھر کے افراد ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مختلف عادتیں برداشت کرتے ہیں تب ہی سب میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ غلطی مجھ سے بھی ہوسکتی ہے میں انسان ہوں۔ آپ مجھے میری غلطی کا احساس ضرور دلائیں۔

بچوں کے امتحان سر پر آگئے۔ کالج اور اسکول کے بچے رات کو پڑھا کرتے تھے۔ ایک صاحب جو گھر میں تنہا تھے رات اس قدر بلند آواز سے ٹرانزسٹر بجاتے کہ بچوں کی پڑھائی میں خلل پڑنے لگا۔ پڑوس کی ایک خاتون بہت بیمار تھیں وہ سو نہیں سکتی تھیں حالانکہ انہیں نیند کی دوا دی جاتی تھی۔ اسی طرح وعظ اور شادی بیاہ کی محفلوں میں لاؤڈ اسپیکر استعمال ہوتا تھا جس سے پڑھائی میں خلل پڑتا تھا اور بیماروں کو تکلیف ہوتی تھی۔ لہٰذا زاہد صاحب نے یونین کے اراکین سے درخواست کی کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بند کیا جائے۔ اور جو صاحب بآوازِ بلند گانے سنتے ہیں ان کو احساس دلایا جائے کہ یہ شور و غل کس طرح نقصان پہنچا رہا ہے۔ بچوں کو پڑھنے کے لیے خاموشی اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ اس بات پر تکرار ہونے لگی۔ بحث مباحثہ اور گرما گرمی شروع ہوگئی آخر یہ طے ہوا کہ رات کو نو بجے کے بعد ریڈیو آہستہ کردیا جائے گا اور دس بجے کے بعد لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں ہوگا۔

زاہد صاحب کی قوتِ برداشت نے اسکوائر کے رہنے والوں میں بھی قوتِ برداشت پیدا کردی۔ اب جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو یونین والے زاہد صاحب کو ضرور بلاتے ہیں اور انہیں آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ یونین کی صدارت قبول کرلیں۔

سوالات

۱۔۔۔۔ زاہد صاحب کون تھے اور کیا کرتے تھے؟

۲۔۔۔۔ زاہد صاحب نے لوگوں کے جھگڑے کو کیسے ختم کرایا؟

۳۔۔۔۔ زاہد صاحب کا کردار بیان کریں۔

۴۔۔۔۔ قوتِ برداشت سے اسکوائر کے رہنے والوں کو کیا فائدہ ہوا؟

سماجی بہبود

انسان کی فطرت ہے کہ وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ وہ مل جل کر رہتا ہے۔ انسان جب اکیلا رہتا ہے تو صرف ایک آدمی ہوتا ہے۔ بہت سے آدمی جب مل جاتے ہیں تو ایک جماعت بن جاتی ہے۔ یہی جماعت ایک خاندان ہوتی ہے۔ اسی طرح محلے، قصبے اور شہر بن جاتے ہیں۔ ہر انسان کے ہر عمل کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے اور ان کا دائرۂ کار مسلسل آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ایک شخص جب کوئی کام کرتا ہے تو اسے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ گھر پر، خاندان پر، قصبے اور شہر پر اس کا کیا اثر پڑے گا — جب سوچ کا یہ انداز ہو جاتا ہے تو شخصی بھلائی کو ترجیح دی جاتی ہے اور یہیں سے سماجی بہبود کی صورت سامنے آجاتی ہے۔ یہی وہ موڑ ہوتا ہے جہاں سے سربراہِ خاندان، استاد، قصبے اور شہر کے حاکم کی ضرورت پڑتی ہے۔ خاندان کا سربراہ خاندان والوں کی بھلائی کے بارے میں سوچتا ہے۔ اُستاد طلباء کا خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح حاکم قصبے اور شہر کی بھلائی کا خیال رکھتا ہے اور ایسا قدم اُٹھاتا ہے جو سب کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔

خاندان اور گھر والوں کی پرورش والدین کی ذمّہ داری ہوتی ہے، تعلیم و تربیت اساتذہ کی اور جان و مال اور عزّت و آبرو کی حفاظت حاکمِ وقت کے فرائض کا حصّہ ہوتی ہیں۔ وہ اس فرض کو بہتر سے بہتر طریقے پر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فرض جہاں حاکمِ وقت کا ہے وہاں عام لوگوں کی بھی کچھ ذمّہ داریاں ہوتی ہیں۔ عام لوگ مل جل کر چھوٹی چھوٹی جماعتیں بناتے ہیں اور عام بھلائی کے کام شروع کرتے ہیں وہ ایسے طریقے تلاش کرتے ہیں جس سے اس مقصد کو حاصل کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ تعلیمی ادارے قائم کرنا، علاج معالجے کے لیے اسپتال کھولنا، مفلس لوگوں کی مدد کرنا اور معذوروں کو سہارا دینا ایسے ہی چند کام ہیں۔ پھر ایسی انجمنیں آپس میں رابطہ قائم کرتی ہیں۔ اس سے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ لوگ ایسے کاموں میں زیادہ سے زیادہ شرکت کرکے اور اپنی حیثیت کے مطابق مختلف کاموں میں حصّہ لیتے ہیں۔ اچھے اور حیثیت والے طالب علم اپنے کمزور اور مستحق ساتھیوں کی مدد کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ دوسروں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ڈاکٹر طبّی امداد مہیا کرتے ہیں۔ سرمایہ دار سرمایہ لگاتے ہیں اور اس طرح سب کی مل جل کوشش سے خوشحالی آتی ہے۔ سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے اور ایک اچھا اور خوشحال معاشرہ جنم لیتا ہے۔ وہ تقلید کا ایک اچھا نمونہ بن کر ابھرتا ہے اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔

سماجی بہبود کا یہ جذبہ در اصل انسان میں پیدائشی ہوتا ہے۔ دوسروں کو ایسے کام انجام دیتے ہوئے دیکھ کر اس میں تقویّت پیدا ہوتی ہے اس کی زندہ مثال سلیم اور گنیش کی زندگی

کا کارنامہ ہے۔

سلیم اور گنیش دو پڑوسی اور اچھے دوست تھے۔ دونوں کے خیالات بچپن ہی سے یکساں تھے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو جو کچھ وہ کھاتے اپنے بہن بھائیوں میں بانٹ کر کھاتے اور دوسرے ہم عمروں کو بھی کھلاتے۔ جب اور بڑے ہوئے تو اس جذبے میں اور قوت پیدا ہوئی دوسرے بچّوں کو خراب کپڑوں میں دیکھتے تو اپنے ماں باپ سے ان کو اچھے کپڑے بنوا کر دینے کی ضد کرتے۔ اسکول میں داخل ہوئے تو وہاں غریبوں کے بچّے بھی تھے۔ ان کی اپنی کلاس میں بھی ایک غریب لڑکا کریم نام کا تھا۔ وہ بے چارہ کاغذ پینسل بھی نہیں خرید سکتا تھا اور دوسرے لڑکوں سے مانگتا رہتا تھا اور اکثر کاغذ پینسل نہ ہونے کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا تھا اور مار کھاتا تھا۔ سلیم اور گنیش یہ دیکھ کر بہت کڑھتے تھے۔ انھوں نے آخر یہ طے کیا کہ گھر سے جو پیسے روزانہ خرچ کے لیے ملتے ہیں وہ خرچ نہ کیے جائیں اور ان پیسوں سے کریم کو کاغذ پینسل خرید کر دیا جائے۔ غرض یہ دونوں خاموشی سے اس کی مدد کرتے رہے۔ وقت گزرتا رہا اور یہ تینوں کامیاب ہوکر اگلی کلاس میں پہنچ گئے۔ جب اگلی کلاس میں گئے تو وہاں فیس کا سوال پیدا ہوا جو ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجبوراً سلیم نے اپنے والد اور گنیش نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا اور اب تک کریم کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے تھے وہ بھی بتایا۔ گنیش کے والد سری چندر اور سلیم کے والد نعیم بچّوں کے اس جذبے سے بہت خوش ہوئے اور ان دونوں نے مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ نعیم صاحب کریم کی فیس دیں اور سری چندر کتابوں اور کاغذ پینسل کا خرچ اٹھائیں۔ غرض یہ انتظام ہوگیا اور تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھا اور ان تینوں نے میٹرک کا امتحان پاس کرکے کالج میں داخلہ لے لیا۔

اسی دوران کریم کی بڑی بہن کی شادی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ کریم کا باپ دن رات محنت مزدوری کرکے بھی کچھ نہ بچا سکا۔ سلیم اور گنیش نے کچھ روپوں کا انتظام تو اپنے والدین سے کیا اور باقی کے لیے اپنے دوست رفیق سے جو کہ ایک مل کے مالک شفیق صاحب کا لڑکا تھا، ذکر کیا۔ شفیق صاحب بڑے اچھے آدمی تھے۔ انھوں نے فوراً انتظام کر دیا اور یوں کریم کی بہن کی شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔

اِدھر سلیم، گنیش، رفیق اور کریم تعلیم حاصل کرتے رہے۔ سلیم ڈاکٹر، گنیش انجینئر اور کریم پروفیسر بن گیا۔ رفیق نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھال لیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ان چاروں دوستوں نے ہم خیال لوگوں کی مدد سے ایک سماجی بہبود کی انجمن بنالی (محلے، علاقے اور شہر کا پوری طرح جائزہ لے کر ایک کالج اور ایک اسپتال کے لیے زمین حاصل کی۔ پھر گھر گھر جاکر اور جلسے جلوس کا انتظام کر کے روپے اکٹھے کیے اور اس طرح کالج اور اسپتال قائم ہو گئے۔ جہاں شہر کے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور مریض اسپتال سے صحت یاب ہو کر دُعائیں دے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ سماجی بہبود کے جذبے اور مِل جُل کر کام کرنے سے ممکن ہوا۔ ورنہ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ اس کے پورا ہونے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔)

سوالات

1. سماجی بہبود سے کیا مراد ہے؟
2. چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہم کس طرح ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں؟
3. کچھ ایسے کام بتائیے جو صرف حکومت کے نہیں بلکہ ہم سب کے مِل جُل کر کرنے کے ہیں؟

اِتّفاق اور محبّت کی طاقت

کمار جس گاؤں میں رہتا تھا وہ شہر جانے والی سڑک سے صرف پانچ کلومیٹر پر تھا۔ اس گاؤں میں پکّی سڑک نہیں تھی جس کی وجہ سے دودھ، دہی، سبزیاں اور انڈے لے کر پیدل یا بیل گاڑی سے شہر پہنچنے میں بہت وقت لگ جاتا تھا اور جو دودھ، سبزیاں، انڈے، مرغیاں وغیرہ شہر لے جاتے تھے وہ خراب ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی بیمار شہر جانا چاہتا تھا تو نہیں جا سکتا تھا۔ مگر کوئی اس سڑک کو پکّا بنانے کا خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ کمار نے سوچا اگر ہم سب مل کر سڑک خود ہی بنالیں اور بڑی سڑک سے اُسے ملا دیں تو ہمارے گاؤں کو کتنا فائدہ پہنچے گا۔

بس کمار نے اپنے دوستوں سے کہا: اگر ہم سب مل کر سڑک بنانا شروع کر دیں تو ہمارے بزرگ بھی ہمارا ساتھ دیں گے اور ہماری مدد کریں گے۔ میرا خیال ہے سب سے پہلے ہم ایسا کرتے ہیں کہ میدان اور کھیتوں کے کنارے جتنے پتّھر، روڑے اور ٹوٹی ہوئی اینٹیں ہیں انھیں لاکر ان گڑھوں کو پاٹ دیتے ہیں۔ پھر گاؤں کے ٹھیکیدار سے کچھ دن کے لیے دُھرمُٹ لے کر گڑھوں میں ڈالے ہوئے پتّھروں کو کُوٹ کُوٹ کر سڑک برابر کر دیں اور پھر اس پر کچھ اور پتّھر اور روڑے ڈال کر دُھرمُٹ سے کُوٹ کُوٹ کر سڑک ڈامر ڈالنے کے لیے تیّار کر دیں گے پھر سب گاؤں والوں سے چندہ جمع کر کے ڈامر لائیں گے اور سڑک پر ڈال کر اس پر ریت اور بجری ڈال دیں گے۔ اس طرح سڑک پکّی بن جائے گی۔ سب لڑکوں نے اس کی رائے سے اِتفاق کیا اور پندرہ بیس پھُرتیلے لڑکے کام کرنے کے جوش میں میدان اور کھیتوں میں پھیل گئے۔ کچھ مَن چلے دوڑ کر گھروں سے تغاری، آٹا گوندھنے کی پرات اور بوریاں لے آئے اور ان میں پتّھر اور روڑے جمع کر کے سڑک پر ڈالنا شروع کر دیے۔ کچھ ہی دیر میں آدھا کلومیٹر سڑک پر پتّھر بچھا دیے گئے۔ لڑکے چوں کہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے تھے اس لیے گاؤں والے ان کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر لڑکا دُھول اور مٹّی میں اَٹا ہوا تھا۔ لیکن

ان کے غبار آلود چہروں پر تھکان کے آثار تک نہ تھے۔ ان کے چہرے مسرت سے تر و تازہ تھے اور خوشی سے دمک رہے تھے۔

شام کو بہت لوگ چوپال میں جمع ہوئے۔ لڑکوں کی ٹولی سب سے آگے بیٹھی تھی۔ زمیندار بھی موجود تھے۔ سب ان لڑکوں کی ہمت اور کام سے بڑے خوش ہوئے اور اپنی اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار تھے۔ پنچوں نے فیصلہ کیا کہ کل سب لوگ لڑکوں کے ساتھ مل کر سڑک کو پکا بنانے میں ان کی مدد کریں۔ گاؤں کے زمیندار نے وعدہ کیا کہ اگر سڑک پر پتھر ڈال دیے گئے تو ڈامر اور سڑک کوٹنے کا انجن وہ منگوا دیں گے۔

دوسرے دن منہ اندھیرے سب لوگ جمع ہو گئے کسی کے پاس دُھرمُٹ تھا کسی نے ہتھوڑا تھام رکھا تھا۔ ایک لڑکا تو گھر سے چمٹا اور ٹھیکنی بھی لے آیا تھا۔ تغاریاں اور بوریاں لے کر لوگوں نے روڑے اور پتھر جمع کیے اور سڑک پر انہیں بچھانا شروع کر دیا۔ عورتیں بھی گھر کے کام کاج سے جلدی جلدی فارغ ہو کر آگئیں اور سڑک پر پتھر ڈالنے لگیں۔

تیسرے دن سڑک کوٹنے کا انجن آگیا۔ انجن نے سڑک کو برابر کر دیا اور ڈامر ڈال دیا گیا۔ مٹی اور بجری جلدی جلدی سڑک پر ڈال دی گئی۔ غرض چار دن کے اندر یہ سڑک بڑی سڑک سے ملا دی گئی۔

جس دن سڑک تیار ہو گئی اس دن گاؤں میں عید کا سا سماں تھا۔ اس دن وہاں میلا لگایا گیا۔ گاؤں کو جھنڈیوں سے سجایا گیا۔ میلے میں گاؤں کی پیداوار اور دست کاریاں رکھی گئیں۔ قریبی گاؤں کے دیہاتی بھی بڑی تعداد میں اپنے گاؤں کی پیداوار اور گائے، بیل بکریاں اور مرغیاں بیچنے کے لیے آ گئے۔ دوکانیں سجائی گئیں۔ شام کو زمیں دار اور علاقے کے دوسرے معزز لوگ بھی آ گئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ گاؤں کے لیے بجلی، اسپتال اور اسکول کی کوشش کریں گے۔ ہونہار، سمجھدار اور محنتی لڑکوں کی تعریف کی گئی اور ان کی تعلیم کے لیے ٹیکنیکل اسکول کھلوانے کا وعدہ کیا گیا۔ کمار کو تعلیمی وظیفہ دینے کا بھی اعلان کیا گیا۔

اب گاؤں میں شہر سے بس بھی آتی ہے۔ اچھا، صاف ستھرا اسکول اور اسپتال بھی

موجود ہے۔ بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر بھی جاتے ہیں۔ اس مثالی گاؤں کے بنانے میں کمار کی ہمت اور عمل کار فرما ہے، جس کی سارا گاؤں عزت کرتا ہے۔

سوالات

۱۔۔۔ کمار نے اپنی کون سی تجویز اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کی ؟

۲۔۔۔ لڑکوں کی محنت کا کیا نتیجہ نکلا ؟

۳۔۔۔ کمار کے کارنامے کو بیان کرو۔ اس کا اسے کیا پھل ملا ؟

۴۔۔۔ گاؤں میں پکی سڑک نہ ہونے سے کیا مشکلات تھیں ؟

۵۔۔۔ پنچوں نے کیا فیصلہ کیا اور زمیندار نے اس میں کیا مدد دی ؟

(۳) لڑکوں کی محنت سے گاؤں میں کچی سڑک کی جگہ پختہ سڑک بن گئی

دوسروں کا احترام

پیٹرک، خرم، نندلال اور فریدوں چار بڑے مخلص دوست تھے۔ ان کی دوستی کی ابتدا اسکول سے ہوئی۔ یہ ایک ساتھ آٹھویں جماعت میں داخل ہوئے اور چاروں ہاکی کے کھلاڑی تھے۔ ایک ہی سیکشن میں پڑھتے تھے۔ خرم اور پیٹرک ایک محلّے میں رہتے تھے جبکہ نندلال اور فریدوں دوسرے محلے کے رہنے والے تھے۔ کلاس میں ساتھ پڑھنا اور وقفے میں کھانا پینا ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ چاروں ورزش کرنے روز کھیل کے میدان میں صبح ہی صبح مُقررہ وقت پر پہنچ جاتے تھے۔ یہ سب کچھ بڑی پابندی سے ہوتا تھا۔ ان کی دوستی پروان چڑھی اور یہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کون دوست کس مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ تہواروں اور تقریبوں پر وہ ایک دوسرے سے گلے ملتے اور سچّی خوشی ان کے چہروں سے ظاہر ہوتی تھی۔ جب عید آئی تو خرم نے اپنے دوستوں کو بھی دعوت پر بُلایا اور سب نے مل جُل کر عید کی خوشی منائی۔

وقت گزرتا رہا اور جاڑوں کے مہینے میں دیوالی کا تہوار آگیا۔ چاروں دوستوں نے مل کر نندلال کے ماتا پِتا کے ساتھ گھر سجایا۔ گھر کی منڈیروں پر دیے جلائے۔ نندلال کی ماں نے نندلال کی پیشانی پر ٹیکا لگا کر ماتھا چوما اور اس کے منہ میں مٹھائی دی اور پھر خرّم، پیٹرک اور فریدوں کو بھی اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلائی اور پیار کیا۔ رات کو سب دوست گھر والوں کے ساتھ چراغاں دیکھنے گئے۔ خرّم نندلال کے خاندان میں اس طرح گھل مِل گیا کہ وہ ایک ہی خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ ان کی ایسی سچّی دوستی کو دیکھ کر اسکول کے دوسرے لڑکے رشک کرتے تھے۔

سردیاں زوروں پر تھیں۔ ایک دن شام کے وقت خرم اتفاق سے گھر پر اکیلا تھا۔ سب لوگ اُسے گھر کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر اپنے ایک رشتے دار کے گھر گئے تھے۔ دروازے پر ایک کار آکر رُکی۔ خرّم نے دیکھا کہ پیٹرک کے ساتھ اس کی

امی ابو، نندلال اور فریدوں بھی ہیں۔ انہوں نے خرم کے امی اور ابو کو پوچھا اور لے اپنے ساتھ بازار چلنے کو کہا۔ خرم نے گھر پر اکیلا ہونے کی وجہ سے معذوری ظاہر کی اور پوچھا کہاں جانا ہے؟

پیٹرک کے ابو نے کہا "بھئی پیٹرک کے لیے کرسمس کے کپڑے خریدنے ہیں اور تم سب دوستوں کے بغیر کپڑے کس طرح خریدے جا سکتے ہیں۔ ہم تمہارے امی ابو کا انتظار کریں گے۔"

جب خرم کے امی ابو آ گئے تو خرم ان کی اجازت لے کر سب کے ساتھ بازار چلا گیا۔ غرض کپڑوں کے علاوہ کرسمس کا درخت، تحفے اور گھر سجانے کے لیے جھنڈیاں اور غبارے خریدے گئے۔ رات گئے تک یہ لوگ خوب گا گا کر ہنسی مذاق کرتے رہے اور گھر سجاتے رہے۔

دوسرے دن دوپہر کو پیٹرک کی بھابی کا فون آیا کہ خرم تم فوراً آؤ بہت ضروری کام ہے۔ خرم گھبرا گیا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر پیٹرک کے گھر پہنچا تو دیکھا کھانے کی میز سجی ہے۔ طرح طرح کے کھانے قرینے سے لگے ہیں۔ نندلال کے لیے مٹھائی اور پوریوں کا انتظام تھا۔ فریدوں خرم کی گھبراہٹ پر ہنسی سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ غرض خوب مزے لے لے کر پیٹرک کے خاندان کے ساتھ تینوں دوستوں نے کھانا کھایا، مزے مزے کے لطیفے سنائے گئے۔ پیٹرک کی بھابی کے ہاتھ کے تیار کیے ہوئے کھانوں کی خوب تعریف ہوئی۔

یہ خوشی کا دور گزر رہا تھا کہ ایک دن سڑک پر چلتے ہوئے کیلے کے ایک چھلکے پر پاؤں پڑنے کی وجہ سے فریدوں پھسل کر ایسا گرا کہ اس سے اٹھا نہ گیا۔ پہلے تو تینوں دوست ہنس کر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ لیکن جب اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑنے لگا تو وہ گھبرا گئے اور اسے لے کر اسپتال پہنچے۔ اطلاع ملتے ہی اس کے پاپا اور ممی بھی گھبرائے ہوئے اسپتال پہنچے۔ خرم نے تسلی دی کہ چوٹ خطرناک نہیں ہے ڈاکٹر نے اطمینان دلایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ ان بچوں کو میں نے صحیح حالت نہیں بتائی تھی

خاصی چوٹ لگی ہے اور پلاسٹر چڑھا کر دو ہفتے تک اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ کیونکہ ایک پسلی بھی چٹخ گئی ہے اس لیے اسپتال میں کم از کم دو ہفتے ضرور رہنا ہوگا۔ فریدوں کے والد رستم جی اور ان کی بیگم پریشان تو بہت ہوئے مگر خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچ گئی۔

ان تینوں دوستوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ اس طرح پروگرام بنایا جائے کہ ایک نہ ایک دوست فریدوں کے پاس ضرور رہے اور انہوں نے اس مشورے پر سختی سے عمل کیا۔ کسی وقت بھی فریدوں کو اکیلا نہ چھوڑا۔

میعاد پوری ہونے پر فریدوں کا پلاسٹر کاٹ دیا گیا۔ اس کی ٹانگ ٹھیک ہو چکی تھی۔ کوئی نقص باقی نہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے تین ماہ کے لیے دوڑ بھاگ پر پابندی لگا دی تھی۔ لیکن فریدوں کو نندلال روزانہ اپنے ساتھ کھیل کے میدان میں لے آتا۔ فریدوں وہاں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دوستوں کو دوڑ لگاتے دیکھا کرتا اور ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ہلکی ورزش کرتا۔

سوالات

۱ـــــ فریدوں کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟

۲ـــــ ڈاکٹری معائنے سے کیا پتا چلا؟

۳ـــــ دوستوں نے اس کی کس طرح خدمت کی؟

۴ـــــ دوستی کے فائدے بیان کرو؟

ور غبارے خریدے

(1st Term)

سماجی بہبود

۱. سماجی بہبود سے کیا مراد ہے؟

ج. ہر انسان کے ہر عمل کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ اور ان کا دائرہ کار مسلسل آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ایک شخص جب کوئی کام کرتا ہے تو اسے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ گھر پر، خاندان پر، قصبے اور شہر پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ جب سوچ کا یہ انداز ہو جاتا ہے تو شخصی بھلائی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اسی کو سماجی بہبود کہا جاتا ہے۔

اسی طرح خاندان کا سربراہ خاندان والوں کی بھلائی کے بارے میں سوچتا ہے۔ استاد طلباء کا خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح حاکم قصبے اور شہر کی بھلائی کا خیال رکھتا ہے اور ایسا قدم اٹھاتا ہے جو سب کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔

۲. چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہم کس طرح ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں؟

ج. ہم لوگ مل جل کر چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنا سکتے ہیں اور عام بھلائی کے کام شروع کر سکتے ہیں۔ ہم ایسے طریقے تلاش کر سکتے ہیں جس سے لوگوں کو فائدہ اور بھلائی حاصل ہو مثلاً تعلیمی ادارے قائم کرنا، علاج معالجے کے لیے اسپتال کھولنا، مفلس لوگوں کی مدد کرنا اور معذوروں کو سہارا دینا ایسے ہی چند کام ہیں۔

۳ کچھ ایسے کام بتائیے جو صرف حکومت کے نہیں بلکہ ہم سب کے مل جل کر کرنے کے ہیں؟

ج بہت سے کام ایسے ہیں جو صرف حکومت کے نہیں بلکہ ہم سب کے مل جل کر کرنے کے ہیں مثلاً

ہم اپنی گلی، محلے اور علاقے کو صاف رکھنے میں حکومت کی مدد کر سکتے ہیں

ہم اپنا کام کرنے کے ساتھ جماعت کے کمزور بچوں کو لکھنے پڑھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

ہم اپنے گھر کا سودا سلف بازار سے خریدتے وقت محلے کی بیوہ یا بزرگ ہمسائی کا سودا بھی بازار سے لانے میں مدد کر سکتے ہیں۔

اگر سڑک پر کوئی حادثہ ہو جائے تو ہم مل کر زخمی کو ہسپتال پہنچا سکتے ہیں۔ فرسٹ ایڈ میں اُن کی مدد کر سکتے ہیں۔

ملک میں نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے ہم قوانین پر عمل کر کے حکومت کی نظم و ضبط کو برقرار رکھنے میں مدد کر سکتے ہیں۔

(1st Term)

اتفاق اور محبت کی طاقت

۱. عمار نے اپنی کونسی تجویز اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کی؟

ج. عمار نے اپنے ساتھیوں سے کہا اگر ہم سب مل کر سڑک خود ہی بنالیں اور بڑی سڑک سے اسے ملا دیں تو ہمارے گاؤں کو کتنا فائدہ ہوگا. اگر ہم سب مل کر سڑک بنانا شروع کر دیں تو ہمارے بزرگ بھی ہمارا ساتھ دیں گے اور ہماری مدد کریں گے۔ میرا خیال ہے سب سے پہلے ہم میدان اور کھیتوں کے کنارے جتنے پتھر، روڑے اور ٹوٹی ہوئی اینٹیں ہیں انھیں لا کر ان گڑھوں کو پاٹ دیتے ہیں۔ پھر گاؤں کے ٹھیکیدار سے کچھ دن کے لیے دھرمٹ لے کر ان گڑھوں میں ڈالے ہوئے پتھروں کو کوٹ کر سڑک برابر کر دیں اور پھر اس پر کچھ اور پتھر اور روڑے ڈال کر پختہ سڑک بنانے کے لیے تیار کر دیں گے۔

۲. لڑکوں کی محنت کا کیا نتیجہ نکلا؟

ج. ہر لڑکا دھول اور مٹی میں اٹا ہوا تھا. لیکن ان کے غبار آلود چہروں پر تھکان کے آثار تک نہ تھے. ان کے چہرے مسرت سے تر و تازہ تھے اور خوشی سے چمک رہے تھے. اس طرح لڑکوں کی محنت سے گاؤں میں کچی سڑک کی جگہ پختہ سڑک بن گئی۔

٣. کمہار کے کارنامے کو بیان کریں۔ اس کا اسے کیا پھل ملا؟

ج. کمہار نے گاؤں کی کچی سڑک کو پختہ کرنے کا سوچا اور پھر اپنے گاؤں کے چند لڑکوں سے مل کر خود اس کام کو کرنے کا آغاز کر دیا۔ سب لڑکوں کی محنت سے جلد ہی سڑک بن گئی۔

جس دن سڑک تیار ہو گئی اس دن گاؤں میں عید کا سا سماں تھا اس دن وہاں میلا لگایا گیا۔ گاؤں کو جھنڈیوں سے سجایا گیا۔ میلے میں گاؤں کی پیداوار اور دستکاریاں رکھی گئیں۔ قریبی گاؤں کے دیہاتی بھی بڑی تعداد میں اپنے گاؤں کی پیداوار اور گائے، بیل بکریاں اور مرغیاں بیچنے کے لیے آگئے۔ دوکانیں سجائی گئیں۔ شام کو زمین دار اور علاقے کے دوسرے معزز لوگ بھی آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ گاؤں کے لیے بجلی، اسپتال اور اسکول کی کوشش کریں گے۔ ہونہار، سمجھدار اور محنتی لڑکوں کی تعریف کی گئی۔ اور ان کی تعلیم کے لیے ٹیکنیکل اسکول کھلوانے کا وعدہ کیا گیا۔ کمہار کو تعلیمی وظیفہ دینے کا بھی اعلان کیا گیا۔

دوسروں کا احترام

س ۱ فریدون کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟

ج ایک دن سڑک پر چلتے ہوئے کیلے کے ایک چھلکے پر پاؤں پڑنے سے فریدون ایسا پھسل کر گرا کہ اُس سے اُٹھا نہ گیا۔

س ۲ ڈاکٹری معائنے سے کیا پتہ چلا؟

ج ڈاکٹری معائنے سے پتہ چلا کہ اچھی خاصی چوٹ لگی ہے اور پلاسٹر چڑھا کر دو ہفتے تک اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ کیونکہ ایک پسلی بھی چٹخ گئی ہے۔ اس لیے اسپتال میں کم از کم دو ہفتے ضرور رہنا ہوگا۔

س ۳ دوستوں نے اس کی کس طرح خدمت کی؟

ج تینوں دوستوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ اس طرح پروگرام بنایا جائے کہ ایک نہ ایک دوست فریدون کے پاس ضرور رہے اور انہوں نے اس مشورے پر سختی سے عمل کیا۔ کسی وقت بھی فریدون کو اکیلا نہ چھوڑا۔

س ۴ دوستی کے فائدے بیان کریں۔

ج دوستی کے بہت سے فائدے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

i) سچے دوست مصیبت میں کام آتے ہیں۔

ii) دوست خوشی اور غمی میں شریک ہوتے ہیں۔

(iii) سچے دوست کبھی بھی اداسی اور غم میں اکیلا نہیں چھوڑتے۔

(iv) دوست آپ کی خوشی سے مدد کرتے ہیں۔

(v) اگر انسان بیمار ہو جائے تو دوست بیمار پرسی کرتے ہیں۔

(vi) سچے دوست آپ کی غلطیوں پر شرمندہ نہیں کرتے بلکہ پیار سے سمجھاتے ہیں۔

(vii) سچے دوست ہمیشہ آپ کے بھلے میں خوش رہتے ہیں۔

(viii) سچے دوست ہمیشہ آپ کے حق میں دعائیں مانگتے ہیں۔

(ix) آپ کی خوشی میں خوش اور غم میں دیکھ کر پریشان ہوتے

(x) دوست ہمیشہ اچھا مشورہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔